JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online):1816-3424
Volume No. 40, Issue No.02

JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.
It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

CONTACT

Dr. Muhammad Asif
Editor, Journal of Research
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:
+92 333 6062921

WEBSITE:
https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

EMAIL:
jorurdu@bzu.edu.pk
muhammadasif12@bzu.edu.pk

ADDRESS

Office of the Journal of Research (Urdu), Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

TITLE OF THE PAPER

اردو خاکہ نگاری میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا حصّہ

AUTHOR(S)

* **Dr. Zeeshan Tabassum**
Assistant Professor, Department of Urdu & Iqbaliyat
The Islamia University of Bahawalpur

CONTACT

* zeeshan.tabassum@iub.edu.pk

HISTORY OF THE PAPER

Received on: December 24, 2024
Accepted on: December 28, 2024
Published on: December 31, 2024

DETAIL(S)

Volume No. 40, Issue No. 02, Page No: 01-22
Publisher:
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University
Multan (Pakistan)-60800

LICENSE

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

COPYRIGHT

©The author(s) 2024. ©Journal of Research (Urdu) 2024.
This publication is an open access article.

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 2, Dec 2024

* ڈاکٹر ذیشان تبسم

اردو خاکہ نگاری میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا حصّہ

Contribution of Dr. Khawaja M. Zakariya in Urdu Sketch Writings

ABSTRACT

Dr. Khwaja Muhammad Zakaria is considered unique and distinguished in Urdu language and literature due to his academic identity and cultural and creative achievements. His main reason is his fame as a researcher and critic, however, after poetry, sketching is of importance in his creative references. It is true that he has not yet compiled a collection of his sketches, however, there are more than a dozen such writings in his various books and columns that meet the art of sketching. Most of these sketches are related to those poets, writers and teachers whom the sketcher has seen closely. He has shown impartial images of these personalities while adhering to the technical requirements of sketching. The prominent feature of his sketches is balance and critical perspective. He neither praises anyone unjustly nor is he unnecessarily sarcastic. He has described the personalities from the angle from which he has seen them. Khwaja Zakaria's style is extremely charming, eye-catching and readable. His observation is profound and the selection of events and materials is most appropriate. The author has tried to conduct an analytical study of Khwaja Zakaria's sketches, keeping in mind the art of sketching, and to bring to light his contributions in this creative dimension.

KEYWORDS

Khawaja Zakariya, Researcher & Critics, Sketch Writings, Balance, Critical perspective, profound observations, critical dimension

اردو کی تخلیقی اصنافِ نثر میں خاکہ نگاری کو منفرد مقام حاصل ہے۔ مرزا غالب کے خطوط اور مولانا محمد حسین آزاد کے شعرائے اردو کے تذکرے "آبِ حیات" (1880ء) میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں، تاہم اس صنف کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے "نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی" (1927ء) سے ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے اردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ سو سال سے بھی کچھ کم بنتی ہے، تاہم اس دورانیے میں جو خاکے لکھے گئے وہ کمیت اور کیفیت ہر دو اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ اردو کے اہم خاکہ نگاروں کی فہرست میں مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالمجید سالک، عاشق حسین بٹالوی، چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، محمد طفیل، ڈاکٹر اسلم فرخی، مجتبیٰ حسین، ممتاز مفتی اور ڈاکٹر انوار احمد وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

خاکہ انگریزی اصطلاح (Sketch) کا اردو ترجمہ ہے، اس کے لیے انگریزی میں ایک دوسرا لفظ (Pen.Portrait) بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کے مطابق:

> ''خاکہ ایک سوانحی مضمون ہے جس میں کسی شخصیت کے اہم اور منفرد پہلو اس طرح اجاگر کیے جاتے ہیں کہ اس شخصیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے۔''(1)

خاکے میں اگرچہ سوانحی کوائف سے متعلق اشارے بھی ملتے ہیں، تاہم خاکہ نگاری کا فن سوانح عمری سے مختلف ہے۔ خاکہ نگار کا بنیادی منصب یہ ہے کہ وہ موضوعِ شخصیت کے کلیدی اور منتخب حوالوں کو تخلیقی اسلوب میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرے۔ خاکہ میں موضوعِ شخصیت کے منتخب پہلو بیان کیے جاتے ہیں اور ان اجزاء کی مدد سے شخصیت کا مجموعی تاثر قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس لیے یہ سوانح کے مقابلے میں مشکل ترین فن ہے۔ خاکہ کو سوانح سے وہی نسبت ہے جو غزل کے شعر کو کسی طویل نظم سے ہو سکتی ہے۔

خواجہ محمد زکریا کی عمومی وجہ شہرت محقق، نقاد، شارح اور مورخِ ادب کی ہے تاہم تخلیقی نثر میں ان کا جوہر خاکہ نگاری کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری کے حوالے سے اگرچہ انھوں نے مستقل تصنیف تو مرتّب نہیں کی مگر ان کی دیگر تصانیف جیسے ''چند اہم جدید شاعر'' (2003ء)، ''تاثراتی اور تنقیدی تحریریں'' (2017ء)، ''کہتا ہوں سچ'' (2024ء)، ''مجید امجد اور میں (2024ء) اور معروف اردو اخبار روزنامہ ''نوائے وقت'' میں شائع ہونے والے بعض کالمز شخصیت نگاری کی ذیل میں آتے ہیں۔ اگر ان تمام خاکوں کو یک جا کر کے مرتّب کر لیا جائے تو مناسب ضخامت کا کم از کم ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ باقاعدہ خاکوں سے قطع نظر خواجہ صاحب کے مصاحبے، تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تواریخِ ادب میں بھی شخصیت نگاری کا وصف مل جاتا ہے۔ وہ مزاجاً مجلسی طبیعت کے مالک ہیں اور ان کی مجلس میں بیٹھنے والے لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کے ساتھ ہونے والی ایک ہی نشست میں ہی مختلف

شعبہ ہائے زندگی سے متعلق جانے کتنی شخصیات سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ خواجہ زکریا کو قدرت نے شخصیت شناسی اور خاکہ تراشی کی غیر معمولی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، انھیں اپنے وقت کے بہت سے اہم مشاہیرِ علم وادب کی رفاقت میسر رہی۔ ان کا مشاہدہ عمیق اور حافظہ بہت مضبوط ہے اور خاص طور پہ اندازِ بیاں بہت دل کش اور جاذبِ نگاہ ہے۔ وہ تکلف اور تصنع سے اجتناب کرتے ہیں اور جس شخصیت پہ اظہارِ خیال کرتے ہیں اس کے بارے میں ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پہ قطعی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اپنے ممدوحین کی یک رخی تصویر نہیں دکھاتے بل کہ ان کی خوبیوں اور شخصی کم زوریوں کو منفرد زاویہ نگاہ کے ساتھ بے کم و کاست مصور کرتے جاتے ہیں۔ ایک اچھے خاکے کی بنیادی خصوصیت غیر جانب داری اور اعتدال و توازن کا ہونا ہے جو خواجہ زکریا کے شخصیوں کا امتیازی وصف ہے۔ ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ اگر وہ سنجیدگی سے خاکہ نگاری پہ توجہ دیتے تو اس صنف میں ان کا مقام یقیناً بہت نمایاں ہوتا اگرچہ انھوں نے اب تک اس صنفِ نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔

خاکہ نگاری میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ خاکہ نگار نے موضوع کے طور پر کس شخصیت کا انتخاب کیا ہے؟ اس نے جس شخصیت کا انتخاب کیا ہے کیا وہ عام دل چسپی کا موضوع ہے؟ کیا قارئین کا ایک وسیع حلقہ اس کے بارے میں جاننے کا خواہش مند ہے؟ اس حوالے سے اگر خواجہ زکریا کے ممدوحین کا جائزہ لیا جائے تو ان سب کا تعلق کم و بیش شعر و ادب اور درس و تدریس سے رہا ہے۔ ان میں سے کچھ شخصیات کا تعلق ادبی مرکز سے رہا اور کچھ بوجوہ حاشیے تک محدود رہیں۔

خواجہ زکریا کی تنقیدی کتاب "چند اہم جدید شاعر" میں شامل چار مضامین شخصیت نگاری کی ذیل میں آتے ہیں۔ ان میں شیر افضل جعفری، سیّد جعفر طاہر، علاءالدّین کلیم اور مجید امجد جیسی ادبی شخصیات شامل ہیں۔ ڈاکٹر امجد طفیل کے مطابق خواجہ زکریا کے ان خاکوں میں "یاد نگاری کا عنصر نمایاں ہے۔"(2) ان کا تجزیہ بڑی حد تک درست ہے کیوں کہ یہ تمام خاکے مذکورہ شخصیات کے سانحاتِ ارتحال کے بعد کی یادگار ہیں، اس اعتبار سے یاد آوری کا وصف فطری طور پر نمایاں ہے۔

خواجہ صاحب جس شخصیت پہ قلم اٹھاتے ہیں اس سے اپنے ذاتی تعلق کے علاوہ اس کے معاصرین اور جس ادبی فضا میں اس کی شخصیت کی تشکیل ہوئی اس کا بھی ذکر کرتے جاتے ہیں، ایسے میں دوسری بہت سی ادبی شخصیات سے بھی قاری کا تعارف ہو جاتا ہے۔ وہ بعض اوقات کسی سے متعلق ایک آدھ ایسا جملہ لکھ دیتے ہیں جو اس کی شخصیت کی کلید بن جاتا

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 2, Dec 2024

ہے۔ مثلاً جعفر شیرازی کے خاکے کی تمہید اس طرح درج کی ہے کہ خود مصنف کی شخصیت اور عمر کے ایک خاص دور کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے جھنگ کی مجموعی ادبی فضا کا نقشہ مترشح ہو جاتا ہے:

> ''شعر گوئی کے سبب شعرائے جھنگ سے بھی متعارف تھا جن کی تعداد ان دنوں نصف صد سے کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ ان میں میرے استاد پروفیسر تقی انجم اور پروفیسر جابر علی سیّد بھی تھے۔ دونوں کی طبیعتوں میں بہت بعد۔۔۔ مگر دونوں کا ہلی میں قربتِ قریبہ کے مالک۔ شہر کے دیگر شعراء میں مرنجاں مرنج آغا نو بہار علی خاں، شاگردِ خیام الہند حیدر دہلوی، جن کا تکیہ کلام تھا کہ ''عمر بھر اساتذہ کی جوتیاں اٹھائی ہیں۔'' طاہر سردھنوی۔۔۔ پان سگریٹ کی دکان، ملن سار اور متواضع۔۔۔ مگر نالاں رہتے تھے کہ ان کا مقام پہچانا نہیں گیا۔ ساحر صدیقی ایک درویش طبع، نیک سیرت جوان، چھوٹا سا قد، خوب صورت آنکھیں، مختصر سی داڑھی، ترنم اس غضب کا کہ جس مشاعرے میں پڑھ گئے کوئی اور مترنم شاعر پھر نہ جم سکا۔۔۔ ان کے علاوہ متعدد شعراء جنھیں خدا سلامت رکھے۔۔۔ شیر افضل جعفری، رفعت سلطان، بے دل پانی پتی، مظفر علی مظفر وغیرہ۔''(3)

خواجہ صاحب فطرتاً صاف گو طبیعت کے مالک ہیں، اس لیے وہ جس شخصیت پہ قلم اٹھاتے ہیں اس کے روشن و تاریک دونوں پہلو بیان کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں بعض مقامات پر لطیف ہجو گوئی کا گمان ہوتا ہے مگر اس میں کسی بغض یا مخاصمت کا عمل دخل نہیں ہوتا، تمام تر شوخ و طرّاری اور تیکھے پن کے باوجود ان کا مجموعی مزاج ہم دردانہ ہوتا ہے۔ وہ کم زوریوں کے اظہار سے نہیں چوکتے مگر ان کا انداز اتنا برجستہ اور دل کش ہوتا ہے کہ موضوعِ شخصیت سے تنفّر کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ انھوں نے جہاں جعفر طاہر کی شخصیت میں موجود بے پناہ انسانیت، مردم بے زاری اور بعض مواقع پہ غیر متوقع خود غرضی کا ذکر کیا ہے تو وہیں ان کی بے پناہ علمیت، کتاب دوستی، قادر الکلامی اور چھوٹوں پہ شفقت اور طبیعت میں موجود سادگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ حسن و قبح کے اس مرقع کی بدولت ان کی شخصیت کی جو تصویر بنتی ہے وہ بے حد متوازن ہے۔ جعفر طاہر کا مذکورہ خاکہ بہت بھرپور ہے اور اس میں خواجہ زکریا نے اپنے عہد کے ایک بزرگ شاعر کی شخصیت کا عمدگی سے احاطہ کیا ہے۔

خاکہ نگار جس شخصیت پہ اظہارِ خیال کرتا ہے اسے گویا حیاتِ نو بخشتا ہے۔ خواجہ زکریا نے علاء الدّین کلیم جیسی غیر معروف، تنہائی پسند اور کم آمیز شخصیت پہ قلم اٹھایا اور انھیں ادبی دنیا میں زندہ کر دیا۔ کلیم پہ ان کا خاکہ ''علاء الدّین کلیم

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 2, Dec 2024

:روشنی کی جستجو"ان کی وفات (26اپریل1965ء) کے فوراً بعد لکھا گیا، مگر اس میں کلیم کی شخصیت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ یک رخا نہیں ہے۔ خواجہ صاحب نے جہاں ان کی مردم بے زار، بدلحاظی، ناؤ نوش اور منہ پھٹ شخصیت کا ذکر کیا ہے، وہیں ان کی وسعتِ علمی اور علم و ادب سے ان کی سچی کمٹ منٹ کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ کلیم پہ لکھا گیا خواجہ صاحب کا خاکہ بے حد دل چسپ اور صحیح معنوں میں تخلیقی رنگ لیے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر عشرت سلطانہ کے مطابق:

> "علاءالدین کلیم کے خاکے میں شخصیت کی پیش کش میں یقیناً انصاف سے کام لیا گیا ہے اور زیبِ داستاں سے گریز کرتے ہوئے انھیں ویسا ہی دکھایا گیا ہے جیسے وہ تھے۔ اس خاکے میں آمد ہی آمد ہے، تصنع اور آورد کا گماں تک نہیں ہوتا۔ بے تکلف انداز اور شوخ اسلوب نے اس خاکے کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔"(4)

خواجہ صاحب نے اس خاکے میں کلیم سے اپنی مختلف ملاقاتوں کا احوال اور ان میں کلیم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے جس طرح متعارف کرایا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ یہاں مختلف مواقعوں سے متعلق چھوٹے چھوٹے مناظر نے مل کر کلیم کی شخصیت کا ایک جامع تاثر نقش کر دیا ہے۔ خواجہ صاحب نے مختلف شخصیات سے متعلق کلیم کی برجستہ آراء، جملہ بازی اور برمحل تبصروں کا ذکر کیا ہے جو خواجہ زکریا کے اس خاکے کو دل چسپ اور بے حد خواندنی بنا دیتا ہے۔ یہ خاکہ آغاز سے ہی قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> "وہ ۲۶، اپریل ۱۹۶۵ء کی ایک دوپہر تھی۔ میں انار کلی سے گزر رہا تھا اتنے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک پروفیسر حامد ڈار پاس سے گزرتے ہوئے رکے اور مجھ سے یوں مخاطب ہوئے:
>
> "تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا۔"
>
> میں اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "نہیں تو! کیا بات ہے؟"
>
> "علاءالدّین کلیم کا انتقال ہو گیا ہے۔"
>
> خبر بڑی ہی اچانک، بڑی حیران کن تھی اور موت کی خبر پر مجھے تو اس وقت تک یقین نہیں آتا جب تک کسی کو سفید لٹھے کی چادر میں لپٹا ہوا نہ دیکھ لوں۔"(5)

یہاں کلیم کے چند چھبتے ہوئے جملے ملاحظہ کیجیے جو خواجہ صاحب کے اساتذہ سے متعلق انھوں نے ارشاد کیے، ناموں کا اندراج نہ ہونے کے باوجود یہ تبصرے مذکورہ اساتذہ کی طرف چغلی کرتے محسوس ہوتے ہیں:

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 2, Dec 2024

''تمہارے ایک استاد کی ایک انعام یافتہ کتاب میں پڑھنے کے لیے خرید لایا۔لیکن پڑھ کر سخت غصہ آیا۔بس جعفر علی اثر کے مضامین کو الٹ پھیر کر رکھ دیا گیا تھا۔چناں چہ میں نے کتاب کو زمین پر رکھا اور زور سے ٹھوکر رسید کی۔''

''تمھارا فلاں فلاں استاد بھی اپنے آپ کو نقاد سمجھتا ہے۔ایک مرتبہ اس کی ایک کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا، بے مغز طول کلامی کا بادشاہ ہے۔مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ کہنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو پھر بھی آٹھ آٹھ سو صفحے کس طرح سیاہ کیے جاتے ہیں۔''(6)

خواجہ زکریا جس شخصیت کا خاکہ لکھتے ہیں اس سے ہونے والی پہلی ملاقات یا ابتدائی تعارف کی کیفیت کا تذکرہ ضرور لکھتے ہیں اور خاکے میں ترتیب سے تعلق کے تمام ارتقائی مراحل کا نقشہ بھی پیش کرتے جاتے ہیں۔جھنگ کے معروف شاعر شیر افضل جعفری سے خواجہ زکریا کا ابتدائی تعارف جس طرح ہوا اس کی کیفیت ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:

''میں ۱۹۵۴ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ کا طالب علم بنا۔ہم گھیانہ میں رہتے تھے اس لیے میں علی الصباح سائیکل پر کالج کو روانہ ہوتا تھا۔اکثر ایک ادھیڑ عمر شخص کو میں جھنگ سے گھیانہ کی طرف جاتے دیکھتا تھا۔مشرقی وضع کا لباس، کلاہ و پگڑی سر پر، دھیمی رفتار سے سائیکل چلاتے ہوئے یہ شخص اکثر میری مخالف سمت میں چلا جاتا۔انھی دنوں مجھے کسی نے بتایا کہ یہ مشہور شاعر شیر افضل جعفری ہیں۔''(7)

خواجہ زکریا خاکوں میں اپنے ممدوح کی عمومی شخصیت، ادبی حیثیت، مزاج، کردار، انفرادیت اور سماجی حیثیت پہ بھی بامعنی اشارے کرتے جاتے ہیں۔وہ ان کے گھر کا محل وقوع اور وہاں کی نشست و برخاست کی کیفیت بھی بتاتے جاتے ہیں جس سے موضوعِ شخصیت کے عمومی رکھ رکھاؤ، حلقۂ احباب، گھریلو عادات اور مہمان سے برتاؤ وغیرہ کا نقشہ مرتب ہو جاتا ہے۔شیر افضل جعفری کے گھر اور وہاں ہونے والی ادبی نشستوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کا گھر جھنگ شہر کے شروع ہی میں ایک گلی کے اختتام پر واقع تھا۔اس سے آگے ناہموار زمین اور ٹیلے تھے۔ان دنوں یہ مکان کچا تھا، جہاں ان کے اکثر مہمان بیٹھ کر گھنٹوں گپ شپ کرتے تھے۔کتنے ہی مقامی اور غیر مقامی شعراء سے وہاں ملاقاتیں ہوئیں، خصوصاً جعفر طاہر وغیرہ کے ساتھ اکثر طویل گفتگوئیں اسی ''ریگ زار'' پر ہوتی رہتی تھیں۔''(8)

مجید امجد، کی باقاعدہ شاعری کا آغاز بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے ہوا، اور آج انھیں فیض، راشد اور میراجی کے ساتھ اس صدی کے نصف آخر کا اہم ترین شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ خواجہ زکریا کا شمار ان معدودے چند محققین و ناقدین میں ہوتا ہے جنھوں نے مجید امجد کی شعری عظمت کو ان کی زندگی میں دریافت کیا اور اس مرکز گریز اور شہرت و نام وری سے بے نیاز حاشیہ نشیں شاعر کو ادب کے مرکزی دھارے میں شامل کرایا اور اپنی زندگی امجد صاحب کو جائز مقام دلانے کے لیے وقف کر دی۔ مجید امجد شناسی کے حوالے سے ان کا سب سے قابلِ ذکر کارنامہ تو ''کلیاتِ مجید امجد'' کی تدوین ہے، تاہم اس منفرد شاعر کے افکار و تصورات اور فنی کمالات سے متعلق خواجہ صاحب کے متعدد مضامین نے بھی تفہیمِ امجد میں کلید کا کام کیا۔ آج مجید امجد کے سوانحی کوائف اور عمومی شخصیت کا جو نقش قائم ہے اس کا بنیادی ماخذ بھی خواجہ زکریا کی وہ تحریریں ہیں جن میں امجد صاحب سے متعلق انھوں نے اپنی یادداشتوں کو پیش کیا ہے۔ ان میں ''مجید امجد کے بارے میں'' کے عنوان سے شامل مضمون خاکہ نگاری کی ذیل میں آتا ہے۔ یہ خاکہ مجید امجد کے سانحہ ارتحال کے فوراً بعد کی یادگار ہے (۱۹۷۴ء) جس میں خواجہ زکریا نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے جھنگ کی ادبی فضا پہ روشنی ڈالتے ہوئے مجید امجد کی ہر دل عزیز شخصیت کا ذکر کیا۔ مجید امجد سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۵۷ء میں شیر محمد شعری کے ہاں منعقدہ ایک غیر رسمی مشاعرے میں ہوئی۔ اس تقریباتی ملاقات میں ہی وہ امجد صاحب کی شاعری کی انفرادیت اور شخصی اوصاف کے گرویدہ ہو گئے۔ خاکے کے مطالعے سے مجید امجد کی شخصیت کا جو عمومی تاثر قائم ہوتا ہے اس کے مطابق وہ بے حد وسیع المطالعہ اور شعر فہم ہونے کے باوجود حد درجہ کم گو، کم آمیز، مدح و ذم سے مستغنی اور شہرت گریز شخصیت کے مالک تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کی منکسر المزاجی، وضع داری، صلح جوئی، مہمان نوازی اور توکل و قناعت پسندی سے متعلق بھی بامعنی اشارے کئے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن کا تاخیر سے ملنا، گھر کی خستہ حالی، طویل بیماری اور فاقہ کشی کی کیفیت میں امجد صاحب کا غیر معمولی صبر و تحمل اور ضبط و احتیاط اس درویش صفت شاعر کی شخصیت کا بے مثال نقش قائم کرتے ہیں۔ خواجہ زکریا کی کتاب ''مجید امجد اور میں'' میں شامل تین مضامین ''وفات پر چند تاثرات''، ''چند یادیں'' اور ''چند ملاقاتیں'' اگرچہ باقاعدے خاکے نہیں ہیں مگر ان میں بھی شخصیت نگاری کے اجزاء موجود ہیں۔

خواجہ زکریا کی کتاب ''تاثراتی اور تنقیدی تحریریں'' تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصّہ ''شخصیت اور فن'' ہے جو سترہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں سے دس تحریریں خاکہ نگاری کے زمرے میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے

دو خاکے ''سیّد جعفر طاہر: گل خار زار'' اور ''علاءالدّین کلیم :روشنی کی جستجو'' ماقبل تنقیدی مجموعے ''چند اہم جدید شاعر'' سے مستعار لیے گئے ہیں،ان کا جائزہ اوپر لیا جاچکا، دیگر ممدوحین میں پروفیسر حمید احمد خاں،ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مشفق خواجہ،پروفیسر مرزا محمد منوّر،حفیظ تائب اور صدیق جاوید کے خاکے شامل ہیں،جن کا تجزیاتی مطالعہ پیشِ خدمت ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں انگریزی زبان و ادب کے نام ور استاد تھے، وہ گورنمنٹ کالج اور کیمبرج کے فارغ التحصیل تھے۔ادبی دنیا میں ان کی شہرت ماہرِ غالبیات واقبالیات کی ہے۔خواجہ صاحب کا ان سے پہلا تعارف اورینٹل کالج میں ہوا، جہاں حمید احمد خاں 1963ء میں وائس چانسلر مقرر ہوئے۔پروفیسر موصوف کی پہلی خوبی جس نے خواجہ صاحب کو ان کا گرویدہ بنایا یہ تھی کہ انھوں نے ایک سرکلر خوب صورت انگریزی میں مشتہر کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ دفتری اہل کار غلط سلط انگریزی لکھنے کی بجائے فائلوں میں بلا جھجک اردو میں اپنی رائے لکھا کریں۔ حمید احمد خاں کی شخصیت کا دوسرا رخ ان کی انتظامی قابلیت سے متعلق ہے۔خواجہ زکریا اس حوالے سے ان کے ایک انتظامی فیصلے کا ذکر بہت دل چسپ انداز میں کرتے ہیں۔وہ بتاتے ہیں کہ پنجاب یونی ورسٹی کے اوقاتِ کار کے مطابق صبح آٹھ بجے ادارہ کھلنے کا حکم جاری ہوا، جس کی تعمیل کے لیے حمید احمد خاں صبح آٹھ بجے اورینٹل کالج پہنچ گئے، یہاں جو معاملہ گزرا اس کا احوال خاکہ نگار کی زبانی دیکھیے:

> ''کالج کے قائم مقام پرنسپل ڈاکٹر شکور احسن تھے۔خاں صاحب نے پورے آٹھ بجے اورینٹل کالج پہنچتے ہی احسن صاحب کے بارے میں پوچھا جو تشریف نہیں لائے تھے (دس پندرہ منٹ بعد وہ آپہنچے تھے) اس پر خاں صاحب ناراض ہوئے اور سیّد وقار عظیم کو فوری طور پر قائم مقام پرنسپل مقرر کرنے کا حکم دیا۔دل چسپ بات یہ ہے کہ وقار صاحب اسی روز وقت پر تشریف لائے تھے ورنہ اس معاملے میں ان کا ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔''(9)

خواجہ زکریا نے اس خاکے میں حمید احمد خاں اور سیّد عبداللہ کے اختلاف کا ذکر بھی بہت قرینے سے کیا ہے جس کی وجہ سے سیّد صاحب کو قبل از وقت اپنے منصب سے سبک دوش ہونا پڑا، تاہم حمید احمد خاں نے اس تلخی کو در گزر کرتے ہوئے سیّد عبداللہ کو انسائیکلوپیڈیا ڈیپارٹمنٹ کا چیئرمین بنا دیا جہاں انھوں نے دائرہ معارفِ اسلامیہ کی تدوین کے حوالے سے شان دار کام کیا۔خواجہ صاحب حمید احمد خاں کی یونی ورسٹی کے لیے تحقیقی کاوشوں کو سراہتے ہیں، خاص

طور پر وہ ان کی کوششوں سے قائم ہونے والے شعبہ "تدریخِ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" کے معترف دکھائی دیتے ہیں جس نے تدریخِ ادبیات کا غیر معمولی منصوبہ محدود ترین وقت میں سولہ جلدوں میں مکمل کیا۔

کتاب میں شامل دوسرا خاکہ "ڈاکٹر وحید قریشی: دیو قامت شخصیت" ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی اورینٹل کالج کے نام ور استاد، معروف محقق و نقاد اور شاعر و خطیب رہے ہیں۔ان کے غیر معمولی تن و توش، خوش خوراکی، گھر کی کیفیت، ان کے والدِ بزرگ وار کی ہیئت و مزاج، انداز نشست و برخاست، منتقم مزاجی، کتاب دوستی، وسیع کتب خانے، تحقیقی ماخذات کی جمع آوری وغیرہ کا نقشہ بہت عمدگی سے کھینچا گیا ہے، جس سے خواجہ صاحب کی باریک بینی اور قوت مشاہدہ کی داد دینی پڑتی ہے۔خاکے کا آغاز ڈاکٹر وحید قریشی کی حلیہ نگاری سے ہوتا ہے۔حلیہ نگاری کو شخصیت نگاری کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔بعض خاکہ نگار اس پہ خصوصی توجہ دیتے ہیں اور موضوعِ شخصیت کی جامع تصویر کشی کرتے ہیں جب کہ بعض جدید خاکہ نگار چہرہ شناسی وغیرہ کے قائل ہی نہیں۔خواجہ زکریا کا رویہ اس حوالے سے متوازن ہے۔وہ اپنے شخصیوں میں پیکر تراشی کرتے ہیں مگر ان کا ہنر یہ ہے کہ وہ شخصیت کے منفرد خط و خال کو مصوّر کرنے میں چند روشن لائنز سے کھینچتے ہیں اور تفصیل و وضاحت کی بجائے کفایتِ لفظی سے کام لیتے ہیں، تاہم اس کے باوجود ان کی تصویر کاری میں کمی کا احساس نہیں ہوتا۔خواجہ صاحب بالعموم خاکے کے آغاز میں ہی قاری کو اپنے ممدوح کی ظاہری شخصیت سے متعارف کرا دیتے ہیں۔ڈاکٹر وحید قریشی جنھیں خاکے کے عنوان میں "دیو قامت انسان" بتایا گیا ہے ان پہ لکھے گئے خاکے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

> "یہ اکتوبر ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ایم۔اے اردو سال اوّل کی تدریس ابھی شروع ہوئی تھی۔ایک دن کلاس میں ایک استاد تشریف لائے۔بہت موٹے اور لمبے۔ہاتھ میں براؤن رنگ کا تھیلا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔سوٹ پہنے ہوئے، ٹائی باندھے ہوئے، سر پر جناح کیپ، کرسی میں پھنس کر بیٹھ گئے۔"(10)

خواجہ زکریا جن شخصیات کو اپنے خاکوں کا موضوع بناتے ہیں ان کی عمومی عادات، مشاغل، روزمرہ معمولات، طرزِ تکلم وغیرہ کا نقشہ بھی دل کش انداز میں کھینچتے ہیں، ایسے میں ان کے خاکوں کا تخلیقی رنگ چوکھا ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی کی دیو قامت شخصیت کی اصل وجہ ان کی خاندانی خوش خوراکی ہے جس کی کیفیت کچھ اس انداز میں بیان ہوئی ہے:

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 2, Dec 2024

''دوپہر کا وقت تھا، غالباً وہ کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ میں پہنچ گیا۔ڈرائنگ روم سے ڈائننگ روم ملحق تھا۔ کھانے کی میز پر برتن پڑے تھے اور پلاؤ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بعد میں ان گنت دفعہ ان کے ہاں گیا ہوں، عموماً میں نے ان کی میز پر پلاؤ ہی دیکھا۔جب میں ذرا بے تکلف ہو گیا تو ایک روز پوچھا: آپ ہفتے میں کتنے دن پلاؤ کھاتے ہیں ؟فرمایا: پہلے تو ہر روز کھاتا تھا،اب ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے اس لیے ہفتے میں دو تین بار سے زیادہ نہیں کھاتا چناں چہ ان کے موٹاپے کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔''(11)

خواجہ زکریا نے اس خاکے میں وحید قریشی کے والدِ گرامی کا نقشہ بھی بہت پر لطف انداز میں کھینچا ہے، یہ حصّہ مکالمہ نگاری پہ ان کی مہارت کا بھی عکاس ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''پہلی دفعہ جب میں ان کے ہاں پہنچا اور گھنٹی بجائی تو انھیں کی وضع قطع کے ایک صاحب باہر نکلے۔اتنے ہی لمبے اور موٹے، شکل میں وحید صاحب سے مشابہت۔میں سمجھا ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔مجھ سے پوچھا: کس سے ملنا ہے؟میں نے بڑے احترام سے کہا: ڈاکٹر وحید قریشی سے۔انھوں نے آواز دی۔وحید! وحید! جواب میں وحید قریشی صاحب کی آواز آئی: جی ابا جی!! وہ بولے ایک لڑکا آیا ہے۔''(12)

کتاب میں موجود تیسرے خاکے کا عنوان ''ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: کھرا انسان'' ہے۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، جن کی شخصیت کو خواجہ صاحب نے ''کھرا انسان'' سے متصف کیا ہے،ان کے خاکے میں خواجہ صاحب بتاتے ہیں کہ وہ بٹالے کے رہنے والے تھے،اسی لیے اردو کے جیّد استاد اور نام ور محقق ہونے کے باوجود ان کے لہجے میں پنجابیت کا غلبہ تھا۔ڈاکٹر صاحب کی علمی شخصیت کی پسِ پردہ جو زندہ دل شخصیت چھپی تھی اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے خواجہ زکریا لکھتے ہیں:

''محفلوں میں ڈاکٹر صاحب اپنا سنجیدگی کا لبادہ اتار کر قصّے کہانیاں اور لطیفے بھی سنایا کرتے تھے، لیکن ان کی اس قسم کی گفتگو میں باریکی کی بجائے بے تکلف ''پنجابی پن'' نمایاں ہوتا تھا۔ایک دفعہ ہم طلبہ کے ساتھ مری، سوات اور کاغان گئے۔۔۔ڈاکٹر صاحب ہم سب سے زیادہ تیز رفتاری سے چلتے تھے اور جسم کو خم کیے بغیر پہاڑوں پر تیر کی طرح چلتے تھے۔۔۔سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کلاس روم کے ماحول سے نکل کر ایک مختلف شخصیت بن جاتے تھے۔میں نے ان

کے ساتھ مری اور ایبٹ آباد میں ہفتوں قیام کیا ہے۔ بڑے اچھے منتظم تھے، تمام ضروریات کا پیش از وقت خیال رکھتے تھے اور بڑے اچھے کک بھی تھے۔"(13)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، کے خاکے میں جہاں ان کی دیانت داری، کام سے ان تھک لگن، معاملات کی درستی، تحقیقی شغف اور بے پناہ خود دادی جیسے شخصی اوصاف کا ذکر ملتا ہے، وہیں ان کی بعض شخصی کم زوریوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے:

"ان کا سٹاف کے ساتھ دو طرح کا رویہ ہوتا۔ مکمل اعتماد یا مکمل شک کا۔ انتظامی معاملات میں یہ دونوں رویے دیر تک ساتھ نہیں دیتے۔ چناں چہ اس کی مثالیں موجود ہیں کہ بعض کلرکوں نے مکمل اعتماد سے ناجائز فائدے اٹھائے اور بعض نے ان کے خلاف زبان درازی کی، تاہم وہ ڈرنے یا جھکنے والے نہیں تھے۔"(14)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (1920ء۔2000ء) کا شمار اورینٹل کالج کے معروف اساتذہ میں ہوتا ہے۔ خواجہ زکریا نے ان کا خاکہ "ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: شخصیت اور فن" کے عنوان سے لکھا۔ یہ خاکہ پہلی مرتبہ شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج کی یادگاری کتاب "ارمغانِ افتخار احمد صدیقی" میں "صدیقی صاحب" کے عنوان سے شائع ہوا۔(15) اس کا آغاز بھی پہلی ملاقات اور صدیقی صاحب کی خارجی پیکر تراشی سے ہوتا ہے:

"ایک دن ادھیڑ عمر کے ایک بلند قامت استاد، تھیلا پکڑے ہوئے کلاس میں آئے۔ معلوم ہوا کہ افتخار احمد صدیقی ہیں اور اسلامیہ کالج سول لائنز کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ گھنی سیاہ داڑھی، گہرا سانولہ رنگ، شیروانی کے ساتھ کھلی مہری کا سفید پاجامہ، سر پر جناح کیپ اور آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک۔"(16)

مشفق خواجہ کی کالم نگاری کا ایک زمانہ معترف رہا، "تکبیر" میں ان کا کالم "سخن در سخن" کے عنوان سے چھپتا تھا جس کے لیے وہ خامہ بگوش کا قلمی نام اختیار کرتے تھے۔ خواجہ زکریا نے ان کا خاکہ "خوش طبع انسان" کے عنوان سے لکھا ہے اور سچ یہ ہے کہ ان کی بذلہ سنجی اور خوش گفتاری کی ایک دنیا اسیر و متاثر رہی ہے۔ خواجہ زکریا نے مشفق صاحب سے ہونے والی مختلف ملاقاتوں کا احوال بہت بے تکلف پیرائے میں لکھا ہے، جس سے ان کی باغ و بہار شخصیت کے ان مٹ نقوش پردۂ ذہن پہ نقش ہو جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کی طبیعت میں بڑی شگفتگی تھی اور بات بات میں نادر نکتے پیدا کرتے تھے۔ایک دفعہ ہم آئیڈیل بکس ہاؤس انار کلی میں بیٹھے تھے۔ڈاکٹر وحید قریشی بھی ساتھ تھے۔میں نے اجازت چاہی اور کہا کہ ایک گھنٹے تک دوبارہ آجاؤں گا۔ان دنوں میرے بچے چھوٹے تھے میں انھیں سکول سے گھر چھوڑتا تھا۔مجھے واپسی پر دیر ہوگئی اور جن انار کلی پہنچا تو خواجہ صاحب سمیت سب لوگ جا چکے تھے۔کراچی جا کر انھوں نے ڈاکٹر صاحب (وحید قریشی) کو خط لکھا جس میں یہ جملہ بھی تھا کہ خواجہ زکریا سے کہیں مشفق کراچی چلا گیا ہے اس لیے اب بے شک آئیڈیل بک ہاؤس چلے جائیں۔''(17)

''مرزا محمد منوّر: عمیق محبت اور نفرت کا انسان'' میں خواجہ زکریا نے مرزا منوّر کے فکری رجحانات، بے پناہ عملیت، مختلف زبانوں پہ دست رس، صاف گوئی، پر اثر خطابت، ادب فہمی، باکمال حافظے اور اقبالیات سے غیر معمولی شغف جیسے شخصی اوصاف کا ذکر بہت مہارت سے کیا ہے۔وہ اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ چالیس سالہ رفاقت میں انھوں نے مرزا منوّر سے بہت کچھ سیکھا خاص طور پہ اپنے بہتر تلفظ کو وہ پروفیسر صاحب ہی کا فیضان بتاتے ہیں۔مرزا منوّر کی انگریزی، فارسی اور عربی زبانوں پر جو دست رس تھے اس سے خاکہ نگار بے حد متاثر محسوس ہوتے ہیں۔ان کے مطابق:

''ایک دن میں گورنمنٹ کالج میں ان سے ملنے گیا تو پتا چلا کہ فضل حسین تھیٹر میں ایم۔اے فلاسفی کے طلبہ کو لیکچر دے رہے ہیں۔میں وہاں جا کر آخری نشست پر بیٹھ گیا۔جب میری سماعت سے ان کا پہلا جملہ ٹکرایا تو وہ انگریزی میں تھا۔میں سمجھا کوئی اقتباس سنا رہے ہیں لیکن چند منٹ بعد معلوم ہوا کہ وہ انگریزی میں لیکچر دے رہے ہیں۔ان کے لہجے میں سر گودھے کا انداز موجود تھا لیکن انگریزی اچھی اور تقریر رواں تھی۔اسی طرح اقبال کانگریس میں جب وہ ایران گئے تو انھوں نے فارسی میں خطاب کیا۔لہجہ غیر ایرانی تھا لیکن فارسی کی مہارت قابلِ داد تھی۔اسی طرح عربی بول چال میں بھی ان کی روانی قابلِ ستائش تھی۔''(18)

حفیظ تائب کی نعت گوئی کا ایک زمانہ معترف ہے۔خواجہ زکریا کی ان سے پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء کے آس پاس ہوئی اور جلد گہرے تعلق میں بدل گئی۔ان کی شخصیت میں موجود بے پناہ جاذبیت کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ زکریا اپنے خاکے ''حفیظ تائب: صاحبِ فنِ مردِ شریف'' کے آغاز میں لکھتے ہیں:

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 2, Dec 2024

''حفیظ تائب ان لوگوں میں سے تھے جو آپ کی زندگی میں بڑی آہستگی سے داخل ہوتے ہیں اور پھر غیر محسوس انداز میں اتنے قریب آجاتے ہیں کہ لگتا ہے گویا آپ اور ان کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔''(19)

حفیظ تائب پہ لکھے گئے خواجہ زکریا کے زیرِ نظر خاکے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت شریف النفس، منکسر المزاج، حلیم الطبع، نرم خو، معتدل مزاج، دین دار، خوش وضع اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔اردو نعت گوئی کے علاوہ انھیں پنجابی شاعری پر بھی مہارتِ تامہ تھی۔وہ اورینٹل کالج میں پنجابی کے استاد تھے اور اتنی محبوب شخصیت تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مختلف الطبع لوگ اس بات پہ متفق تھے کہ وہ درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھیں اور دوستوں اور یونی ورسٹی انتظامیہ کی خواہش پہ جب تک صحت وہمت نے اجازت دی وہ کالج سے وابستہ رہے۔

معروف محقق اور ماہرِ اقبال صدیق جاوید سے خواجہ زکریا کی دوستی جھنگ کے زمانے سے تھی۔ڈاکٹر امجد طفیل کے مطابق:'' صدیق جاوید سے خواجہ محمد زکریا کے دوستانہ تعلقات سب سے زیادہ گہرے اور دیرپا رہے ہیں۔''(20)شاید اسی لیے انھوں نے صدیق جاوید کے بارے میں لکھے گئے خاکے کا عنوان ''صدیق جاوید: یادوں میں زندہ یارِ جہندہ'' منتخب کیا۔خواجہ صاحب نے صدیق جاوید کے تعلیمی مراحل، ادبی مشاغل، سیاسی نظریات، ملازمت، شادی، بیماری اور تحقیقی خدمات سے متعلق ایسے باریک اشارے کیے ہیں جن سے خاکے میں سوانحی رنگ پیدا ہو گیا ہے، تاہم وہ خاکہ نگاری اور سوانح عمری کے مابین امتیاز و حدود کا شعور رکھتے ہیں، اسی لیے وہ جملہ مشاہدات کے اندراج کی بجائے اپنے انتخابی ذہن کو بروئے کار لاتے ہیں اور مخصوص احوال و واقعات کے بیان سے شخصیت کا حقیقی تاثر سامنے لے آتے ہیں۔

خاکہ نگار نے صدیق جاوید کے شخصی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ بے حد وضع دار اور متواضع شخص تھے، طلبہ وطالبات کی معاونت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، ذمہ دار طبیعت کے مالک تھے، دوستوں کے لیے کسی حد تک بھی جانے کے لیے تیار رہتے تھے۔شائستہ طبع، مہمان نواز اور کتاب دوست تھے۔خواجہ صاحب کا یہ خاکہ ان کے دل کی آواز محسوس ہوتا ہے، اسی لیے یہ بے حد متاثر کن ہے۔صدیق جاوید یدباش اور من موجی انسان تھے اور خاکہ نگار کے مطابق زندگی کے ہر دور میں کسی خاص ٹرانس میں آجاتے تھے۔ مثلاً ایک زمانے میں انھیں فلم بینی سے بہت

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 2, Dec 2024

دل چسپی پیدا ہو گئی، دلیپ کمار ان کے پسندیدہ ہیرو تھے، اس پسندیدگی نے ان کی شخصیت میں جو رنگ بکھیرے اس کا تذکرہ خاکے میں بڑے پر لطف انداز میں ہوا ہے:

> ''صدیق جاوید نے شعوری طور پر اپنا حلیہ دلیپ کمار جیسا بنا لیا تھا۔ بالوں کی تراش خراش میں ''دلیپ کٹ'' اختیار کر لیا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ اہتمام سے ماتھے پر گراتا، اسی کا سا لباس زیب تن کرتا اور دلیپ جیسا نظر آنے کی کوشش کیا کرتا تھا چناں چہ لڑکے مذاق سے اسے دلیپ کا بھائی کہتے تھے اور ناوقف طلبہ سے اسے دلیپ کا چھوٹا بھائی کہہ کے متعارف کراتے اور وہ بھی تردید نہ کرتا بل کہ خوش ہوتا کہ دلیپ جیسا نظر آنے والی اس کی کوشش کتنی کامیاب ہے۔''(21)

خواجہ زکریا نے روزنامہ ''نوائے وقت'' کے لیے ''ذوق و شوق'' کے مستقل عنوان سے قریب اڑھائی سال ادبی کالمز تحریر کیے۔ ان میں انھوں نے بہت سی علمی و ادبی شخصیات کے بارے میں تعارفی اور تاثراتی تحریریں بھی لکھیں۔ ان میں سے بعض تحریریں شخصیت نگاری کی تعریف پہ پورا اترتی ہیں۔ ان میں سے ایک کالم معروف مزاحمتی شاعر حبیب جالب کے بارے میں لکھا گیا جو پانچ اقساط میں شائع ہوا تھا اور ہر اعتبار سے خاکہ نگاری کے فن پہ پورا اترتا ہے۔

''حبیب جالب: جہدِ مسلسل کی علامت'' کے عنوان سے لکھے گئے اس خاکے کی پہلی قسط 5 جون 2022ء کو شائع ہوئی جب کہ پانچویں اور آخری قسط 3 جولائی 2022ء کو منصۂ شہود پر آئی۔ خواجہ زکریا نے خاکے کے تمہیدی حصّے کا آغاز ان کے شعری پس منظر سے کیا، جس کا ملخص یہ ہے کہ حبیب جالب کا شعری سفر رومانوی شاعر کی حیثیت سے ہوا۔ وہ بے حد مترنم آواز کے مالک تھے اور مشاعروں کی ضرورت بنتے جا رہے تھے، دریں اثناء جنرل ایوب خان نے 1958ء میں ملک میں پہلا مارشل لاء لگا دیا اور خواجہ صاحب نے درست نشان دہی کی ہے کہ ایوب خان کے اس مارشل لاء نے جالب کو مزاحمتی اور انقلابی شاعر بنا دیا۔ اوپر تلے لگنے والے مارشل لاؤں نے اس سے مساوات، جمہوریت اور انصاف کی ترویج اور استحصال کے خاتمے کے نعرے لگوائے۔ حبیب جالب سے خواجہ صاحب کی پہلی ملاقات 1957ء میں لائل پور کے ایک مشاعرے کے بعد بس سے جھنگ آتے ہوئے ہوئی اور یہ تعلق جالب کی وفات تک قائم رہا۔ جالب صاحب کسی سبب سے جھنگ میں قیام پذیر رہے تو وہاں واقع ''نور ہوٹل'' پہ ان سے ملاقات رہنے لگی۔ یہاں عبدالحمید عدم، شیر افضل جعفری اور جعفر شیرازی سے بھی علیک سلیک ہوئی۔ کالم کے ذریعے معلوم

ہوتا ہے کہ معروف سرمایہ دار سعید سہگل نے لائل پور میں واقع کاٹن مل میں انھیں ملازمت دی، یہاں شان دار مشاعرے ہوا کرتے تھے مگر جالب نے چند ایسے اشعار پڑھے جس سے سرمایہ داری پہ چوٹ پڑتی تھی، نازک مزاج مالکان کو جالب کا یہ کلام ہضم نہیں ہوا، اس لیے وہ ملازمت سے فارغ کر دیئے گئے۔خواجہ زکریا نے جالب صاحب کی شخصیت کے کلیدی حوالوں میں ان کے ہاں موجود بے پناہ شاعرانہ نرگسیت، گرم مزاجی اور احساسِ عزت کی نشان دہی کی ہے ۔مذکورہ خصوصیات کے ساتھ حاسدین سے بچ کے رہنا یقیناً مشکل امر تھا اور اسی وجہ سے جالب سرد گرم تجربات سے گزرتے رہے جس کا احوال اس خاکے میں بہت سلیقے سے کیا گیا ہے۔۔خواجہ زکریا 1958ء میں بی اے کے لیے لاہور آئے تو یہاں جالب سے تعلق کا نیا دور شروع ہوا۔جالب صاحب کے توسط سے معروف اشاعتی ادارے مکتبہ کارواں آنا جانا شروع ہوا، یہاں منیر نیازی، حفیظ جالندھری، پروفیسر مرزا منور، کرامت حسین جعفری، شریف کنجاہی، پروفیسر غلام مصطفی خان وغیرہ سے ملاقاتیں رہنے لگیں جن کی صحبت کی بدولت خواجہ صاحب کے ادبی ذوق کی تربیت و تہذیب ہوئی۔

خواجہ صاحب جہاں اپنے ممدوح کی شخصیت اور ان سے ذاتی تعلق کی نوعیت کا ذکر کرتے ہیں، وہیں اس کے ادبی کاموں کا جائزہ بھی پیش کرتے جاتے ہیں، یہاں ان کا مزاج تحقیقی بھی ہوتا ہے اور تنقیدی بھی۔وہ ایک استاد کی طرح زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرتے جاتے ہیں۔مثلاً جالب کے پہلے شعری مجموعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''برگ آوارہ'' کی اشاعت سے جالب کا پہلا شعری مجموعہ مشاعروں کے سامعین تک پہنچا۔یہ مجموعہ ان کے دیگر شعری مجموعوں کی اشاعت کا نقطہ آغاز ہے اور ان کی شاعری کے پہلے دور کا اختتام بھی ہے۔''برگ آوارہ'' میں ان کی بیشتر غزلیات یک جا ہو گئی ہیں جو مشاعروں میں بہت مقبول تھیں اور جسے ان کی شاعری کا رومانی دور کہنا چاہیے۔''(22)

خواجہ زکریا جس شخصیت پہ قلم اٹھاتے ہیں اس کے مختصر سوانحی کوائف بھی بیان کر دیتے ہیں تاکہ قاری اس کے حالات اور پس منظر کو جان کر قدرے بہتر تفہیم کر سکے۔مثلاً جالب کے خاندانی پس منظر اور تعلیمی کیفیت کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''ان کا گھرانا بہت مفلوک الحال تھا۔شروع ہی سے اس بچے نے اپنے ماں باپ کے ہم راہ پیٹ بھرنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی تھی۔۔۔اس ماحول میں لشٹم پشٹم انھوں نے ساتویں جماعت تک پڑھا۔''(23)

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 2, Dec 2024

حبیب جالب کچھ عرصہ دہلی میں مقیم رہے جس کی وجہ سے ان کا لہجہ اہل زبان جیسا ہو گیا۔ تقسیم کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی، وہ بہتر معاشی مستقبل کی تلاش میں کراچی آ گئے، یہاں ادبی حلقوں سے تو شناسائی ہوئی مگر ملازمت نہ مل سکی اس لیے محنت مزدوری پہ گزارا کیا۔ پھر لاہور آ گئے، 1945ء سے مشاعروں کی رونق بننے لگے۔ لائل پور (موجودہ نام فیصل آباد) میں مشاعروں کے انعقاد کے حوالے سے شہرت رکھنے والی کوہِ نور ٹیکسٹائل ملز تھی، وہاں ملازمت مل گئی۔ اس شہر میں جالب صاحب کا دل لگ گیا، خواجہ صاحب نے اس کی وجہ نہیں بتائی مگر ان کا انداز معنی خیز ہے: ''کوئی خاص وجہ تھی کہ وہ اس شہر کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے پہلے مجموعے ''برگ آوارہ'' کی بعض غزلیات اور نظمیں اس راز کو آشکار کر سکتی ہیں۔''(24) دریں اثناء 7 اکتوبر 1958ء کو مارشل لاء لگا تو جالب نے بڑی دلیری کے ساتھ جبر و استبداد کے اس دور کی اپنی نظموں میں تصویر کشی کی۔ ان کا مجموعہ '' سرِ مقتل'' اپنی مزاحمتی شاعری کی وجہ سے بحق سرکار ضبط ہوا۔ یہاں خواجہ زکریا نے جالب کے توسط سے ایوب دور کی سیاسی، صحافتی اور ادبی تاریخ پہ بھی عمدہ اشارے کیے ہیں۔

خواجہ زکریا بنیادی طور پر محقق اور نقاد ہیں اس لیے ان کے خاکوں میں شعراء اور ادباء کے تخلیقی کام سے متعلق حوالے بھی آ جاتے ہیں، اس سے خاکے کے فن کو تو ضعف پہنچتا ہے مگر قاری کے لیے یہ اجتہاد مفید اور معلومات کی فراہمی کا سبب بنتا ہے۔ اس خاکے میں بھی خواجہ زکریا نے جالب کی بعض نظموں کے تاریخی پس منظر پہ تنقیدی اشارے کیے، مثلاً ان کے مطابق جالب کی معروف نظم ''دستور'' 1962ء کے صدارتی آئین کے نفاذ کے پس منظر میں تخلیق ہوئی جس میں صدر کا الیکشن عام لوگوں کے حق رائے دہندی کی بجائے اسی ہزار بنیادی جمہوریت کے ممبروں کے ذریعے ہونا طے پایا تھا۔ ایسی تخلیقات پہ جالب کو ریاستی جبر کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا مگر انھوں نے جس استقامت اور پامردی سے حکومتی جبر کا سامنا کیا، اس کو سراہتے ہوئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''جالب نے ہر قسم کے خطرات کا بے مثال دلیری سے مقابلہ کیا۔ لالچ، دھمکی، خوف، تھانے، جیل غرض حکومت جو کچھ کر سکتی تھی کرتی رہی مگر جالب حکومت کے خلاف اسی قسم کی نظمیں لکھتا رہا اور جلسوں میں پڑھتا رہا۔''(25)

صدارتی الیکشن 1964ء میں ہوئے۔ ایوب کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح تھیں۔ جالب نے ان کی بھرپور کمپین چلائی۔ یہاں خواجہ صاحب چند تلخ حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جالب کی مقبولِ عام انقلابی شاعری

کے توڑ کے لیے ایوب اور اس کی سیاسی ٹیم نے کوشش کی کہ حفیظ جالندھری کو مقابلے میں لائیں مگر انھوں نے فاطمہ جناح کے احترام میں گریز کیا، تب مشیر کاظمی جیسے ابن الوقت کا انتخاب ہوا مگر وہ جالب کے مقابلے میں نہ ٹک سکے۔تب حکومت نے ان کے خلاف مضحکہ خیز پرچے کاٹے مگر جالب ڈٹے رہے۔ایوب زور زبردستی جیت گیا مگر اسے کراچی اور ڈھاکہ میں شکست ہوئی۔

ایوب دورِ حکومت کا اہم ترین واقعہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ تھا۔خواجہ صاحب ان دنوں اورینٹل کالج میں لیکچرر تھے۔انھوں نے اس جنگ کو قریب سے دیکھا اور وہ سمجھتے ہیں کہ "جیسا جذبہ لوگوں میں میں نے اس وقت دیکھا بعد میں کبھی نظر نہیں آیا۔"(26)تاہم اعلانِ تاشقند اور اس پہ بھٹو کے سیاسی پراپیگنڈے سے قومی وحدت کو دھچکا لگا۔ان کے مطابق:

> "بھٹو نے لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ جیسے ہم نے جو کچھ جنگ میں جیتا تھا، اسے ایوب نے میز پر ہار دیا۔انھوں نے مختلف بیانات دے کر لوگوں کو یقین دلا دیا کہ اس معاہدے میں کچھ شقیں ہیں جن کا راز میں بعد میں فاش کروں گا۔حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی خفیہ شق نہیں تھی۔جو کچھ تحریری معاہدے میں موجود تھا وہی اصل بات تھی مگر جذباتی قوم جو ایوب کے طویل اقتدار سے تنگ آئی ہوئی تھی بھٹو کی گرویدہ ہو گئی۔"(27)

خواجہ زکریا نے یحیٰ خاں کے دورِ حکومت کا نقشہ بھی چند سطروں میں کھینچ دیا۔اس زمانے میں بھی جالب معتوب رہے، وہ قید و بند کی کیفیت میں رہے اور 16 دسمبر 1971ء کے سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد رہا ہوئے۔بھٹو صاحب کا چھے سالہ دورِ اقتدار بھی اس جمہوریت پسند شاعر کو راس نہ آیا۔خواجہ زکریا کے مطابق وہ نظریاتی شاعر تھے اور وڈیرہ ازم کے سخت خلاف تھے، جب کہ بھٹو صاحب کے سیاسی رفقاء میں وڈیروں کی بڑی تعداد تھی۔ان کی وجہ سے جالب اس دور میں بھی مزاحمتی شاعری کرتے رہے، نتیجتاً اس جمہوری دور میں بھی وہ پابندِ سلاسل ہوتے رہے۔ایک موقع پہ انھیں اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ اپنے جواں مرگ بیٹے طاہر عباس کی رسم قل میں موجود تھے۔بھٹو صاحب کے زمانہ میں انھوں نے بہت وقت جیل میں کاٹا جس کا حاصل "گوشے میں قفس کے" کی صورت میں سامنے آیا۔خواجہ صاحب نے اس دور میں لکھی گئی جالب کی بعض نظموں کا پس منظر بھی بتایا جو آج کے قارئین کے لیے اس کلام کی

تفہیم نو کا باعث بنتا ہے مثلاً اُن کی معروف نظم ''رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے'' جو فلم ''زرقا'' کی زینت بنی کا پس منظر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایوب کے دور میں نیلو کو زبردستی ایوانِ صدر میں لے جا کر شہنشاہِ ایران کے سامنے رقص کرنے پر مجبور کیا گیا تو اس نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ اس پر جالب نے نظم لکھی تھی۔''(28)

مزید برآں:

> ''بھٹو کے دور میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ ایک ابھرتی ہوئی مشہور اداکارہ ممتاز کو کسی تقریب کے لیے لاڑکانے طلب کیا گیا۔ اس پر جالب نے ایک موثر نظم لکھی جس میں مستزاد کا ٹکڑا تھا ''لاڑکانے چلو، ورنہ تھانے چلو''۔(29)

مجموعی طور پر یہ خاکہ نما مضمون بہت دل چسپ اور خواجہ صاحب کی دیگر تحریروں کی طرح بے حد خواندنی ہے۔ انھوں نے جالب کے ساتھ اس کے عصری سیاسی و سماجی منظرنامے کو بھی پیش کیا اور یہ حقیقت ہے کہ جالب جیسے شاعر کی شخصیت کو اس کے عہد سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں۔ خواجہ صاحب نے جالب کے توسط سے پاکستان کی سیاسی تدریج کے بہت سے معدوم ہوتے اوراق کو زندہ کر دیا ہے جس سے قاری کے ذہنی و علمی پس منظر میں بہت کچھ اضافہ ہوتا ہے۔

۱۹۷۶ء کے انتخابات میں جس طرح دھاندلی ہوئی اور اس پہ جالب کا جو تخلیقی ردِّعمل آیا خواجہ صاحب نے اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ اس دھاندلی کے نتیجے میں اپوزیشن نے ایسی زوردار تحریک چلائی کہ سول وار کا خطرہ پیدا ہو گیا، جگہ جگہ کرفیو لگا، بھٹو صاحب اپوزیشن کو انگیج نہیں کر سکے، اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا۔ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو پہ محمد احمد قصوری کے قتل کی ایک پرانی ایف آئی آر کے تحت مقدمہ چل پڑا۔ جالب بھٹو سے ناخوش اور ان کے زخم خوردہ تھے اس لیے وہ کچھ وقت خاموش رہے۔ اس زمانہ کا ایک واقعہ جس کے خواجہ زکریا عینی شاہد ہیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک دن پاک ٹی ہاؤس میں جالب اور میں بیٹھے تھے کہ پیپلز پارٹی کے چند ورکرز آ گئے اور جالب سے کہنے لگے کہ تم نے ہر ظالم حکومت کی مخالفت کی ہے، اب خاموش کیوں بیٹھے ہو؟

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 40, Issue No. 2, Dec 2024

جالب نے بڑے تحمل سے جواب دیا: ''میں بھٹو ہائی کمیٹی کا ممبر نہیں بن سکتا۔'' وہ لوگ چلے گئے تو جالب نے مجھے کہا: ''اب کوڑے لگتے ہیں، ان کے دور میں گولیاں لگتی تھیں۔''(30)

جالب صاحب اپنے مزاج کے موافق جلد ضیاء الحق کے خلاف بھی لکھنے لگے۔ وہ افغان جنگ کے حوالے سے ضیا جیم کے خلاف تھے، اس لیے سخت مخالفانہ نظمیں لکھیں جن میں ''ظلمت کو ضیا، صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا'' بہت مقبول ہوئی اور ضیا نے اس کی پاداش میں انھیں جیل میں ڈال دیا۔ خواجہ زکریا کے بارے میں ان کے مخالفین یہ غلط تاثر پھیلاتے ہیں کہ وہ بھٹو مخالف اور ضیا کے حامی تھے، جب کہ حقیقت اس کے بر خلاف ہے، وہ ضیا کے بدنامِ زمانہ ریفرنڈم کی حقیقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے خود لاہور میں گھوم پھر کر مختلف پولنگ سٹیشنوں پر ہونے والی کارروائی دیکھی، پرچی ڈالنے والے نہ ہونے کے برابر تھے البتہ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا کہ لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں ووٹ ڈال رہی ہیں۔''(31)

اسی ریفرنڈم کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے حبیب جالب نے دلیری کے ساتھ اپنی مشہور نظم ''ریفرنڈم'' ہی کے عنوان سے لکھی جس کا پہلا شعر یہ تھا:

شہر میں ہو کا عالم تھا
جن تھا یا ریفرنڈم تھا

جالب صاحب بھٹو کے عدالتی قتل کے خلاف تھے اور کھل کر اس کا اظہار کرتے رہے تاہم بے نظیر بھٹو کے پہلے دورِ حکومت میں بھی وہ بعض اقدامات سے ناخوش ہو کے اپنے مزاج کے مطابق انتباہی نظمیں لکھتے رہے، تاہم چودھری اعتزاز احسن جیسے ہم دردوں کی وجہ سے حکومت کا رویہ ان سے بہتر رہا۔ 13 مارچ 1993ء کو جالب کا انتقال ہوا۔ خواجہ زکریا نے کالم کے آخر میں جالب کی شاعری کے بنیادی مزاج اور اس کے مراحل کا ذکر کیا۔ وہ جالب کے نظریہ شاعری اور تصوّرِ حیات پہ روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جالب عوامی جمہوریت کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی شدید خواہش رہی کہ غریب عوام کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں۔ لوگوں کو اچھی تعلیم دی جائے۔ انصاف ملے، روزگار مہیا کیا جائے۔ ایسی مساوات ہو کہ زیادہ اونچ نیچ ختم ہو جائے۔''(32)

یہ جالب صاحب ہی کا نہیں خود خواجہ صاحب کا بھی نصب العین ہے جس کا اظہار وہ اپنی گفتگو اور تحریروں کے ذریعے کرتے رہتے ہیں۔خواجہ زکریا کی اس طویل "جالب بیتی" سے ان کے جو شخصی اوصاف سامنے آتے ہیں ان کے مطابق وہ ایک اصول پسند، ثبات قدم، نڈر، دلیر، بے خوف، صاحبِ استقلال، جواں مرد، عوام دوست اور غیرت مند انسان تھے۔وہ بہت کم تعلیم یافتہ تھے مگر ان کا سیاسی شعور، جمہوریت پسندی اور انسان دوستی انھیں مفکر و دانش ور شعراء کی صف میں شامل کر دیتی ہیں۔خواجہ صاحب کا جالب سے تعلق خاطر صرف دوستی پہ مبنی نہیں لگتا، وہ ان کے عوام دوست اور جمہوریت پسندانہ خیالات سے متفق اور ان کے قدر دان بھی محسوس ہوتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں بھی جالب کے اثرات قبول کیے اور کھل کے جنرل پرویز مشرف کی آمرانہ حکومت کی مخالفت کی، اسی طرح جالب کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے وہ جمہوری قیادتوں کی نااہلی، عوام دشمن اقدامات اور رشوت ستانی پہ کھل کے تنقید کرتے رہے ہیں۔

خواجہ زکریا صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ان کے تحریروں میں وہ تخلیقی حسن اور قوّت موجود ہے جو صاحبِ اسلوب ادباء کا وصف ہوتا ہے۔ان کے خاکے پر از معلومات ہونے کے باوجود دل چسپی کے عنصر سے خالی نہیں، قاری انھیں شروع کرنے کے بعد آخری سطر تک پڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے صفحۂ ذہن پہ موضوعِ شخصیت سے متعلق بھرپور تاثر نقش ہو جاتا ہے۔خواجہ صاحب نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے ان سے ممکنہ حد تک انصاف کیا ہے، وہ اپنے ممدوح کی شخصیت کے نمایاں اوصاف، اس کی عادات و اطوار اور عمومی مزاج کو ہنر مندی سے پیش کرتے ہیں۔تمام تر ہمدردی کے باوجود اپنے خاکوں میں وہ غیر جانب دار مبصّر محسوس ہوتے ہیں۔خواجہ صاحب کے خاکوں کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہیں اور ان کا ہدف درست تصویر کشی ہوتا ہے۔اپنے خاکوں میں وہ خود کو نمایاں کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اپنے ممدوح کے مقابلے میں بالعموم حاشیے میں رہتے ہیں البتّہ کہیں کہیں جزئیات نگاری کے زیرِ اثر موضوعِ شخصیت سے ان کی توجہ ہٹ جاتی ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بنیادی طور پر استاد ہیں اور تدریسی رجحان کی وجہ سے وہ قاری کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنا اپنا فریضۂ منصبی سمجھتے ہیں۔خواجہ زکریا بنیادی طور پر گفتگو کے آدمی ہیں، اسی لیے ان کی تحریر و تقریر بھی ایک دوسرے کا عکس محسوس ہوتے ہیں۔مجلسی طبیعت اور محفل آرائی کی وجہ سے ان کی بہت سی تخلیقی توانائیاں نذرِ احباب ہوتی رہی ہیں۔وہ اس سے کہیں زیادہ اور بہتر خاکے لکھ سکتے تھے مگر مجلس آرائی کی وجہ سے کم فرصتی کا شکار رہے، اس کے باوجود انھیں نے جو خاکے لکھے ہیں وہ بہت معیاری

ہیں، اور انھوں نے جن شخصیات پہ قلم اٹھایا ہے وہ اپنی منفرد خصوصیات کے ساتھ قاری کے ذہن ودل پر گہرے نقوش ثبت کرتی ہیں۔

خواجہ زکریا کا اسلوب بیک وقت تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی ہے۔ جہاں وہ کسی شخصیت سے متعلق اپنے ذاتی تعلق کا ذکر کرتے ہیں وہاں ان کا اسلوب شگفتہ، تخلیقی اور بے حد دل چسپ ہو جاتا ہے، جب کہ جہاں وہ اپنے ممدوح کے ادبی کمالات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ہاں علمی سنجیدگی اور تحقیقی و تنقیدی رنگ غالب آنے لگتا ہے۔ گویا ان کا اسلوب بڑی حد تک امتزاجی ہے مگر لطف یہ ہے کہ وہ بہر صورت قادر الکلام محسوس ہوتے ہیں۔

خاکہ نگاری کی حد تک خواجہ صاحب کا اسلوب تخلیقی ہے۔ ان کے ہاں گفتگو کا انداز ملتا ہے۔ تحریر میں دل چسپی کا عنصر آخر تک موجود رہتا ہے۔ وہ ایک ماہر خاکہ نگار کی طرح شخصیت کے کلیدی حوالے پیش کرتے ہیں۔ واقعات کا انتخاب ایسا ہوتا ہے جن سے ممدوح کی شخصیت اپنے حقیقی حوالوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

1۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم، 1985ء)، ص 72
2۔ امجد طفیل، ڈاکٹر، خواجہ محمد زکریا: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2022ء)، ص 162
3۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، چند اہم جدید شاعر (فیصل آباد: مثال پبلی شرز، طبع سوم، 2020ء)، ص 94
4۔ عشرت سلطانہ، ڈاکٹر، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (حیات و فن) (لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، 2023ء)، ص 263
5۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، علاء الدّین کلیم: روشنی کی جستجو، مشمولہ: چند اہم جدید شاعر، ص 132
6۔ ایضاً، ص 135
7۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، چند اہم جدید شاعر، ص 85
8۔ ایضاً، ص 86
9۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، تاثراتی اور تنقیدی تحریریں (لاہور: سنگت پبلشرز، 2017ء)، ص 13
10۔ ایضاً، ص 25
11۔ ایضاً، ص 26
12۔ ایضاً

13۔ ایضاً، ص 38-39

14۔ ایضاً، ص 40

15۔ رفیع الدّین ہاشمی، پروفیسر ڈاکٹر، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ارمغان افتخار احمد صدیقی (لاہور: شعبہ اردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، دسمبر 2009ء)، ص 25-15

16۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، تاثراتی اور تنقیدی تحریریں، ص 51

17۔ ایضاً، ص 65

18۔ ایضاً، ص 113

19۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، بحوالہ مضمون: حفیظ تائب: صاحبِ فن مردِ شریف، مشمولہ: تاثراتی اور تنقیدی تحریریں، ص 118

20۔ امجد طفیل، ڈاکٹر، خواجہ محمد زکریا: شخصیت اور فن، ص 186

21۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، تاثراتی اور تنقیدی تحریریں، ص 137-136

22۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، حبیب جالب: جہدِ مسلسل کی علامت۔۲، مشمولہ: روز نامہ نوائے وقت (لاہور: بتاریخ: 12 جون 2022ء)، ص: ادارتی صفحہ

23۔ ایضاً

24۔ ایضاً

25۔ حبیب جالب: جہدِ مسلسل کی علامت۔۳، مشمولہ روز نامہ نوائے وقت (لاہور: بتاریخ: 19 جون 2022ء)

26۔ حبیب جالب: جہدِ مسلسل کی علامت۔۴، مشمولہ روز نامہ نوائے وقت (لاہور: بتاریخ: 26 جون 2022ء)

27۔ ایضاً

28۔ ایضاً

29۔ ایضاً

30۔ حبیب جالب: جہدِ مسلسل کی علامت۔۵، مشمولہ: روز نامہ نوائے وقت (لاہور: بتاریخ: 3 جولائی 2022ء)

31۔ ایضاً

32۔ ایضاً